مغربی تہذیب کا چیلنج: سید ابو الحسن علی ندوی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

The Challenge of Western Civilization: An Analytical Study of Syed Abul Hasan Ali Nadvi's Thoughts

Dr. Muhammad Abubakar Siddique
Research Associate, Islamic Research Index, AIOU Islamabad
Email: muhammad.abubakar@aiou.edu.pk
ORCiD: 0000-0003-3160-5697

Abstract
This research paper delves into the intellectual legacy of Syed Abul Hasan Ali Nadvi, a prominent Islamic scholar, and his nuanced perspectives on the challenges posed by Western civilization. The analytical study examines Nadvi's profound insights into the clash between Islamic and Western values, exploring the historical context and ideological foundations that underpin his thoughts. The paper employs a comprehensive approach, drawing on Nadvi's writings, speeches, and scholarly contributions to illuminate his responses to the multifaceted challenges presented by Western civilization. It scrutinizes the intersections of religion, culture, and societal dynamics as perceived through Nadvi's discerning lens, offering a nuanced understanding of his intellectual framework. The research contributes to a broader discourse on the cultural encounter between Islamic and Western civilizations, shedding light on Nadvi's role as a key figure in shaping Islamic thought in response to the evolving challenges of the modern world.
Keywords: Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Western civilization, Islamic thought, cultural encounter, intellectual legacy

عصر حاضر میں مسلمانوں کو بے شمار چیلنجز درپیش ہیں۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے بقول اس دور کا سب سے بڑا چیلنج "مغربی تہذیب کی کامل پیروی ہی زندگی کی شرط اور ترقی وطاقت کی واحد راہ"[1] ہے۔ دنیا مغرب کی پیروی میں اندھا دھند بھاگی چلی جا رہی ہے۔ اس فکر و تہذیب نے بہت سی تہذیبوں کو اپنے اندر ضم کر لیا ہے اور دیگر تہذیبوں کی شناخت کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ دیگر تہذیبوں کی طرح مسلمان بھی اس تہذیب سے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ خود مغربی دنیا بھی سر توڑ

کوشش کر رہی ہے کہ مغربی تہذیب مسلم ممالک میں پوری طرح نفوذ کر جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو اگر خطرہ لاحق ہے تو وہ صرف مسلم تہذیب سے ہے۔

مغربی تہذیب سے قبل دنیا کی سب سے بڑی تہذیب مسلم تہذیب تھی اور اس نے صدیوں تک دنیا کو مسحور کیے رکھا ہے۔ اگر مسلم حکمرانوں سے وہ سنگین غلطیاں نہ ہوتیں جس کی بنا پر انہیں سیادت و قیادت سے ہاتھ دھونا پڑے تو آج مسلم تہذیب مغربی تہذیب پر حاوی ہوتی اور اسے مغربی تہذیب کا دست نگر نہ ہونا پڑتا۔

اس وقت مغربی تہذیب کو عالم اسلام ہی سے خطرہ ہے اور وہ عالم اسلام کی بیداری سے قبل پوری طرح مسلم ممالک پر تہذیبی فتح چاہتی ہے۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں کی اسی سوچ اور محنت نے مسلم ممالک میں ایسی کشمکش کو جنم دیا ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایمانی قوت و حمیت اور مستقبل کے لیے شعور اور مغربی فکر و تہذیب کے مقابلے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔

1. پہلا چیلنج: مغربی تہذیب کا مقابلہ

مسلم ممالک کی عوام اسلام کے ساتھ گہری وابستگی رکھتی ہے۔ وہ اسلام کے نظام فکر و عمل کی بالادستی چاہتے ہیں لیکن ان ممالک کے ارباب اقتدار مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ کسی طرح ان ممالک کو مغربی ممالک کی کالونی کا درجہ دے دیں۔

ارباب اقتدار کی ذہنی ساخت، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقش قدم پر چلایا جائے۔ اس مقصد کے لیے جو دینی تصورات، قومی عادات، ضوابط حیات اور قوانین و روایات آڑے آئیں، ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے اور ملک و معاشرے کو پوری طرح "مغربیت" کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے، یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی، مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ اور استیلاء کی کیفیت نے (جس کی نظیر تاریخ انسانی میں مشکل سے ملے گی) ممالک کے مادی و سیاسی اقتدار نے سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ نشان بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں یہ عزائم صرف مسلم ممالک کے سربراہوں تک ہی محدود نہیں بلکہ عالمی سامراج نے اس مقصد کی برآری کے لیے اپنے مادی وسائل جھونک دیے ہیں۔ وہ مسلم ممالک کے سربراہوں اور متوقع سربراہوں

سے لے کر بادشاہ سازی تک کے سارے مراحل میں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ یوں مسلم ممالک ایسے سربراہ سامنے آتے ہیں جن میں ملک وملت کا احساس نہیں ہوتا۔ مغربی تہذیب کے دل دادہ یہ سربراہ مغرب سے وفاداری نبھاتے ہوئے اسلامی قانون اور ضوابط کی معطلی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہ صورت حال اس صدی میں اکثر مسلم ممالک میں دیکھنے میں آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی میں اکثر مسلم ممالک میں عوام اور سربراہوں کے درمیان کشمکش جاری ہے اور ہر مسلم ملک میں اسلامیت کی تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ رد عمل کے طور پر اب تقریباً ہر مسلم ملک میں مغربیت اور اسلامیت دونوں کی مؤثر آوازیں موجود ہیں اور اپنے اپنے نصب العین کے مطابق کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔

2. مغربی تہذیب کے مثبت و منفی عناصر کا چیلنج

مغربی تہذیب سے متعلق ہمارے ہاں مثبت و منفی دونوں طرح کے رویے موجود ہیں۔ چوں کہ خود مغربی تہذیب میں بھی مثبت و منفی عناصر موجود ہیں اس لیے ہمیں بھی اعتدال سے کام لیتے ہوئے مثبت عناصر کو قبول کرنا چاہیے اور مغرب کی مثبت کارکردگی کا اعتراف کرنا چاہیے لیکن منفی عناصر کی پردہ پوشی بھی نہیں کرنی چاہیے کہ یہی اعتدال کی پہلی شرط ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بقول اسلام پسندوں کے لیے یہ بڑی آزمائش ہے کہ مغربی تہذیب جو ما قبل کی دریافتوں کا نچوڑ ہے اور مثبت و منفی تمام عناصر کا مرکب ہے اس کے منفی عناصر کا سدباب کیا جائے، مثبت عناصر کو قبول کیا جائے اور دونوں میں توازن برقرار رکھا جائے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "اس تہذیبی مرکب نے اس مسئلہ کی پیچیدگی اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے اور عالم اسلام کو ایک نازک اور دشوار پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے اور اس کے راہ نماؤں اور مفکرین کی ذہانت کے لیے ایک امتحان بن گیا ہے۔"[3]

مغرب میں انسانی علوم پر جو تحقیق کی گئی ہے بلاشبہ وہ ایک عظیم سرمایہ ہے۔ قرآن وسنت میں بے شمار مقامات پر ہمیں یہ حکم ملتا ہے کہ علم وحکمت اہل ایمان کی میراث ہے، جہاں سے بھی ملے اس حاصل کر لینا چاہیے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے جنگی تیاریوں اور عسکری ترتیبات میں جو طریقے اختیار کیے وہ زمانہ جاہلیت کی تحقیقات ہی تھیں لہٰذا مغرب کے علوم سے مستفید ہونے میں شرعی لحاظ سے کوئی* حرج نہیں ہے۔

3. جدید علوم سے کنارہ کشی کے نقصانات

موجودہ دور میں ہمیں اس بات کا بخوبی ادراک ہونا چاہیے کہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جدید علوم کی دولت سے مالا مال ہونا ضروری ہے۔ جن معاشروں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں بدلتی ہوئی دنیا اور زندہ حقیقتوں سے چشم پوشی کی اور

جدید علوم پر محنت نہیں کی انہیں شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جنگوں میں شکست سے دوچار ہوئے اور اہل مغرب کے ہاتھوں مفتوح ہوئے۔ جدید علوم سے بیگانگی اور تحقیق و جستجو سے فرار کی روش معاشرے کی ترقی کے لیے زہر قاتل ہے۔

اسلامی ادوار میں تمام سلاطین کے ہاں علم پروری کے آثار ملتے ہیں، اموی، عباسی، ترک ادوار میں اہل علم کی سرپرستی کی گئی اور علمی تحقیق وترقی کے لیے تمام وسائل مہیا کیے گئے جس کی وجہ سے علمی میدان میں مسلمانوں نے اپنا نام پیدا کیا اور وہی دور اسلام کا سنہری دور تھا۔ جب مسلمانوں نے اس شعبے کو نظر انداز کر دیا تو اہل کفر نے علمی میدان میں اپنے قدم جما لیے اور مسلمانوں پر مسلط ہو گئے۔

مولانا ندوی نے لکھتے ہیں:

> ”سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا، علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم ترقی میں بھی۔۔۔۔ لیکن افسوس ہے کہ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، وہ اپنی جگہ پر رہے اور یورپین قومیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔“[4]

دراصل یہ وہ دور تھا جب سلطنتوں پر قدیم فلسفہ یونان کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی۔ جدید طبیعی علوم کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور اہل یورپ مشاہدے اور تجربے کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ اہل مغرب مسلمانوں کی باقیات سے مستفید ہو کر سائنس اور تجربہ کی طرف آرہے تھے اور اہل اسلام فلسفے اور نظریاتی جمود پر کاربند تھے۔

اسی عہد میں اہل کلیسا اور مغربی سائنس دانوں کے درمیان بھی معرکے ہوئے۔ اہل کلیسا نے اپنے سیاسی اثر ورسوخ سے اپنی مذہبی خامیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ سائنس دانوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا اور بعض کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ غرض انہیں مذہبی کہانیوں کے تجزیہ و تحلیل سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ طبیعی علوم کی حقیقی بنیادوں کی جانچ پڑتال سے روکا گیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب اس تبدیلی کو روکنا ناممکن ہے تو اہل کلیسا نے مصلحت کوشی سے کام لیا، اپنے اثرات کو محدود کر لیا اور ان کے ساتھ مصالحت اختیار کر لی۔ اب انہوں نے اپنے روایتی مدارس میں جدید علوم کو جگہ دی اس کا بڑا اچھا اثر پڑا کہ اہل کلیسا کی اگلی نسل جدید علوم و مباحث سے بخوبی واقف تھی اور ہر میدان میں مادیت و لادینیت کی تحریک کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جب کہ ترکوں کی علمی حالت زار بارے خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں:

> ”عثمانیوں کے ہاں علماء کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے علوم جدیدہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ نئے خیالات کو اپنے قلم رو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا،

جب تک ملت اسلامیہ کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے، نتیجہ کیا ہوا کہ علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔"[5]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یورپ نے تحقیق و جستجو اور تجربے سے اپنے آپ کو علمی و عسکری طور پر مضبوط کر لیا جب کہ مسلم ترک سلاطین اس بدلتے Trend سے چشم پوشی کرتے رہے، آخر عسکری میدان میں ترکوں نے شکست کھائی اور اہل مغرب قابض ہو گئے۔

4. جدید علوم سے بے گانگی کے اثرات موجودہ عہد میں

مولانا ندوی نے بے شمار مشاہدات ایسے نقل کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کے نفوذ اور اس کے تسلط میں ایک بڑا حصہ ان جمود پرست عوام کا ہے جو ہر نئی چیز کو بدعت خیال کرنے لگتے ہیں۔ جمود پرست عوام کے نزدیک کسی بھی قسم کی ایجاد خواہ وہ جواز سے بڑھ کر وجوب کی حیثیت رکھتی ہو، قابل تعزیر جرم قرار پاتی ہے۔

بااثر طبقے کا یہ تشدد پسندانہ رویہ اور حقائق سے لاعلمی بڑے سانحات کو جنم دیتی ہے۔ اس عمل کا رد عمل بہت سے افسوس ناک نتائج پر منتج ہوتا ہے۔ مولانا ندوی نے سفر افغانستان کے دوران بدلتی ہوئی صورت حال اور مغرب پسند خواتین کے کچھ مشاہدات بھی نقل کیے ہیں جو مغربی تہذیب کی حمایت کرتی ہیں۔ وہاں خواتین کے حقوق اور تعدد ازواج پر بحث جاری ہے اور خواتین مغربی تہذیب و فکر کے زیر اثر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگی ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ وہاں کے عوام غیر ضروری شدت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ خواتین زمانے اور حالات کی ضروریات کا ادراک رکھتی ہیں لیکن روایتی مسلم بااثر طبقہ اس کی اہمیت کو سمجھنے کا روادار نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کالجز اور یونیورسٹیز میں جو طبقہ پیدا ہو رہا ہے وہ اہل اسلام کے طرز عمل سے نالاں ہے اور مغربی فکر و تہذیب کا بھرپور حامی ہے۔

مولانا ندوی لکھتے ہیں:

"ہم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ 1928ء اور 1973ء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ امیر امان اللہ خان کے دور حکومت تک افغان قوم اسلامی افغانی روایات پر بڑی مضبوطی سے قائم تھی اور اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے تھی، اس کا تعصب غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر امان اللہ خان کی بعض قدیم روایات کی خلاف

ورزی کی بنا پر ان کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا اور ان کو تاج و تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے اور افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جاپڑی ہے۔۔۔۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانی خواتین ذہنی و فکری انتشار و اضطراب کی کس منزل سے گزر رہی ہیں اور غیر ملکی تہذیب و ثقافت کا پروپیگنڈا اور اس کے اثرات کس حد تک پہنچ چکے ہیں۔"[6]

5. مغربی تہذیب کی مثبت و منفی خصوصیات

مغربی فکر میں حریت رائے کا غلط استعمال، معاشرتی انارکی، جنسی عدم تحفظ، خواہشات کی پیروی اور معاش و معاشرت کی آزادی ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے خاندان کا ادارہ تباہ ہو گیا ہے۔ اس سبب سے وہاں نہ تو خاندان بچا ہے نہ وہاں اجتماعیت کا ایسا تصور بچا ہے جس میں بڑوں کا احترام، حقوق اور فرائض کی کوئی صورت بنتی ہو۔ وہاں بچوں کی تعلیم و تربیت والدین کی خدمت اور حقوق اور ضعیف والدین کو سنبھالنا اولاد کی ذمہ داری نہ ہے۔ وہاں کا قانون عیش و عشرت کے حصول کے لیے نوجوانوں کو ساز گار ماحول فراہم کرتا ہے۔

مغربی تہذیب میں حکومت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ معاشرے کے افراد کو ایسا ماحول فراہم کرے جس میں افراد مکمل طور پر آزادنہ زندگی بسر کریں اور زندگی رنگینیوں سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہوں۔

مغربی تہذیب کے قبول اور اس سے استفادے کی زور پکڑتی تحریک اہل دانش اور داعیانِ اسلام کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اگر اس تہذیب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے تو موجودہ حالات ساز گار نہیں ہیں۔ اہل اسلام مغرب کی تقلید میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ انہیں واپس لانا بہت ہی مشکل امر ہے۔ اگر اس تہذیب کو اختیار کر لیا جائے تو مثبت اور منفی پہلوؤں جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر تعلیم کے حصول میں گنجائش دی بھی جائے تو ایک نیا خطرہ ہمارے سامنے ہے جس سے ہمیں اقبال نے خبر دار کیا تھا:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اور اکبر الہ بادی کے بقول:

شیخ مرحوم کا قول مجھے اب یاد آتا ہے
دل بدل جائیں تعلیم بدل جانے سے

مغربی تہذیب کے اثرات نے اہل اسلام کو مغرب کا دست نگر بنا دیا اور وہ اہل مغرب سے زیادہ عیش و عشرت میں مگن ہو گئے۔ اہل اسلام نے اپنی قدرتی وسائل اہل مغرب کے ہاتھوں بیچ کر سامان تعیش خرید لیا۔ ان کے بازار راحت و آرام اور آسائش کی چیزوں سے بھر گئے۔ حالاں کہ مسلمانوں کے لیے نمونہ تو یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالی نے پیش کش کی تھی کہ عرب کے پہاڑوں کو سونے میں بدل دیا جائے مگر آپ نے مسکنت کو اختیار فرمایا۔ جب کہ اہل اسلام دنیاوی راحت و آرام کے دلدادہ ہو گئے، عیش و آرام کے حصول کو مقصد زندگی سمجھ لیا اپنی ذمہ داریوں کو بھلا دیا۔ مولانا ندوی ڈان پریز کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "قدیم مشترک تہذیبی ورثہ جس نے مختلف طبقات کو مربوط کر رکھا تھا وہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے کہ شیوخ کے اعلی خاندانوں کے افراد جو تیل کی دولت کے باعث مالا مال ہو چکے ہیں وہ مغربی مصنوعات، انوکھی چیزوں رسم و رواج اور مغربی مذاق سے متاثر ہونے لگے ہیں اور اس تبدیلی نے نچلے طبقوں میں بے چینی پیدا کر دی ہے کیوں کہ وہ اس طرح کی ظاہری شان و شوکت کی زندگی بسر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔"[7]

مغربی تہذیب نے اسلامی روح اور سادگی کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ لوگ عیش و عشرت اور آرام کے طلب گار ہیں۔ جب کہ تہذیبی معرکہ سر کرنے کے لیے جس سرگرمی کی ضرورت ہے وہ ان میں موجود نہیں ہے۔ لوگ اس خطرے سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں جو ان کے گھروں میں داخل ہو چکا ہے۔ تہذیبی جنگ میں یہ صورت حال انتہائی مایوسی کا باعث ہے۔ اگر لوگ اپنے مقصد اور ذمہ داریوں کا شعور نہیں رکھتے اور اس مسئلے کی نزاکت کو نہیں سمجھ پاتے تو اس کا انجام تباہی ہے۔

6. دوسرا چیلنج: مادیت، نفس پرستی اور زر پرستی کا مقابلہ

مادیت پسندی اس عہد کا سب سے بڑا چیلنج ہے اس نے ہر طبقے کو متاثر کیا ہے۔ مادیت پسندی کی بیماری جدید نہیں ہے، یہ قدیم رذائل میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کی اصلاح کر کے اس بری عادت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن اس دور کا چیلنج یہ ہے کہ مادیت پرستی اب نئے دلائل سے لیس ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس کی پشت پر عظیم فلسفے کھڑے ہیں اور اس کا تعارف ایک برائی طور پر کروانا مشکل ہو چکا ہے۔

مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "اس طرح اس دور کا سب سے بڑا چیلنج مادیت کا چیلنج ہے، یہ ایک ایسی کلی حقیقت ہے جس کے اصول و انواع تو سیکڑوں ہو سکتے ہیں لیکن جنس ایک ہے، جنس ہے مادیت۔ اب

اس کے انواع سرمایہ داری ہے، اشتراکیت بھی ہے، اشتمالیت (کمیونزم) بھی ہے اور
دوسرے اقتصادی فلسفے بھی ہیں لیکن سب کا منتہی اور "نقطۂ جامعہ" قدر مشترک
(Common Factor)مادیت ہے، نفس پرستی ہے۔"[8]

اس صورت حال سے قبل مادیت پرست اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے تھے، ان میں احساس جرم موجود تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم ایک برائی میں مبتلا ہیں۔ اُس دور کے مادیت پرست اعتراف جرم کرتے تھے اور دنیا سے کنارہ کش انسانوں کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے اور ان کے سامنے جھک جاتے تھے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کی قسم کھائی ہے جو گناہ میں مبتلا ہیں لیکن ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ [9]

لیکن اب یہ صورت حال نہیں رہی، مادیت پرست طبقہ اب قناعت پسندوں کو احمق اور بے وقوف سمجھتا ہے۔ ان کے خیال میں قناعت پسند لوگ کم ہمتی کا شکار ہیں اور دنیا کی ضرورتوں سے بے خبر اور بے نیاز ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی مادیت کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ اس طرح پورا معاشرہ مادیت کی لپیٹ میں ہے۔ اس فکر نے معاشرے کو خوب سے خوب تر اور زیادہ سے زیادہ ترکا Trend متعارف کرایا ہے اور لوگ اس میدان میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہیں۔

مادیت پرستی بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس کی وجہ سے انسان خود غرض ہو جاتا ہے، مفاد پرست ہو جاتا ہے، رشتہ داری کا احساس ختم ہو جاتا ہے، لالچ اور حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسان خود بھی بے چینی شکار ہوتا ہے اور معاشرے پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرے کا ایک ایسا منظر ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں لوگ خود غرض اور مفاد پرست ہیں اور کسی کو کسی کا احساس نہیں ہے۔

مولانا ندوی نے یہاں مشرق و مغرب کے دو کیمپ متعارف کرائے ہیں۔ پہلا کیمپ مغرب کا ہے جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ اس بات پر مصر ہے کہ فرد کو ملکیت کی آزادی ہو۔ وہ ذرائع معاش اپنی ملکیت میں رکھے، اسے استعمال کرے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو۔ کسی شخص یا گروہ حتی کہ حکومت کو بھی اس میں دخل اندازی کا حق نہ ہو۔ جب کہ مشرقی کیمپ جس کی قیادت روسی کیمونزم کے ہاتھ میں ہے اس بات کا دعوے دار ہے کہ ذرائع معاش اور روزگار فرد کی انفرادی ملکیت یا کسی خاندان کی ملکیت نہ ہو۔ وسائل اور ذرائع ملکیت میں اشتراک ہو اور پوری قوم ان وسائل سے برابری کی بنیاد پر مستفید ہو۔ ان تمام وسائل و ذرائع کا انتظام حکومت کے پاس ہونا چاہیے۔

ان دونوں کیمپوں میں محض انتظامی اختلاف ہے مگر مادیت پرستی کی دعوت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کا مقصد زندگی اور دنیا کی نعمتیں صرف اس لیے ہیں کہ انسان ان سے پوری طرح لطف اندوز ہو اور اس کے رستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کھانے پینے اور عیش و عشرت کے سوا اس دنیا کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے راستے میں اگر کوئی رکاوٹ آئے تو اسے دور کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ گویا عیش و عشرت کا تحفظ اور فراہمی حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

زندگی کا مقصد کیا ہے، انسان کیوں پیدا ہوا اور اس کی منزل کیا ہے؟ ان سوالوں کی دونوں کیمپوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی بنیاد پر مادیت پرستی قائم ہے اور یہی بنیاد اسلام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی زندگی کا مقصد آخرت کی تیاری ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہاں جو کچھ انسان کر رہا ہے، آخرت میں اس کا جواب دینا پڑے گا۔ جو آدمی دنیا میں مصیبتوں میں مبتلا ہے تو اسے مرنے مارنے اور انتقام کی بجائے اپنی آخرت پر نظر رکھنی چاہیے اور جو دنیا میں راحت و آرام میں ہے اسے اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ [10]

اسلامی نقطہ نظر سے یہ دنیا راحت و آرام کی جگہ نہیں بلکہ یہ آزمائش کی جگہ ہے۔ زندگی کا مقصد دنیاوی لذتوں کا حصول نہیں بلکہ آخرت کی تیاری ہے۔ یہاں کا ہر عمل، اچھا یا برا لکھا جا رہا ہے اور آخرت میں اس کا حساب دینا پڑے گا اور اعمال کے مطابق اس کا بدلہ ملے گا۔

یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے راستے بالکل جدا ہو جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے لیے دنیا سب کچھ ہے اور آخرت کچھ بھی نہیں۔ جب کہ اسلامی تہذیب کے لیے دنیا کی کوئی حیثیت نہیں جب کہ آخرت سب کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب کو اپنائے ہوئے شخص اور ایک مسلمان کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عصر حاضر کا المیہ یہ ہے کہ مسلم ممالک عملاً مادیت کی دوڑ میں شریک ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب ہزار ہا نقائص کے باوجود اس معاملے میں حق بجانب ہے کہ دنیا کی لذتوں سے پوری طرح مستفید ہوا جائے۔ حالاں کہ یہ بات اسلامی نقطہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آج کا مسلمان دونوں کشتیوں کا مسافر ہے۔ وہ اسلام کی برکتیں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور یورپ سے درآمد شدہ تخلیق زر کی مشینیوں سے بھی دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔ اگرچہ حالات کے پیش نظر معاشی ترقی کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا لیکن فکر کی بات مسلمانوں میں مادیت کا رجحان ہے۔ اس کا مداوا کرنا اہل

فکر و دانش کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کو اس مسئلے کی اہمیت سمجھائیں اور انہیں مادیت پرستی، نفس پرستی اور زر پرستی کے نقصانات سے آگاہ کریں۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> "اور یہ ہماری حالت ہے کہ جیسے کوئی گھوڑا چھوٹ جائے اور اس کا راکب بے اختیار ہو جائے۔ مادیت ہمیں سرپٹ دوڑائے لیے پھر رہی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم گھوڑے کو کس طرف موڑیں گے اور اس کو کس طرح چھوڑیں گے۔ دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں، خندق میں لے کر کود جائے گا، کسی کھائی میں چھلانگ لگائے گا، سمندر میں کود جائے گا، ہمیں پتہ نہیں، تو اس وقت ہمارے پورے تمدن کا یہ حال ہے کہ تمدن ہمارے اختیار میں نہیں رہا، تمدن کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔"[11]

موجودہ دور میں مسلمان جس لالچ میں مبتلا ہو گئے ہیں اس سے نکلنا انتہائی دشوار ہے۔ اس کا طریقہ یہی کہ لوگ پھر سے قناعت کی طرف لوٹ آئیں اور دنیا کی عارضی چیزوں کو اپنی نظروں سے گرا دیں اور ان چیزوں کے حصول کے لیے کوشش کریں جن کا اہل اسلام سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔

7. مادیت پرستی کے نقصانات

مادیت پرستی کے اسلامی معاشرے پر بہت سے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور معاشرے سے اسلامی خصوصیات ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

دینی و اخلاقی انتشار:

معاشرے کے مقتدر طبقات میں مادیت پرستی کی وجہ سے دینی فکر اور احساس کا خاتمہ ہو چکا ہے اور انہیں مذہبی ذمہ داریوں کا ادراک اور احساس نہیں ہے۔ ان کا مقصد اپنی خواہشات کی پیروی ہے اور وہ اس مقصد کے لیے ہر طرح کا کام کر گزرتے ہیں۔ وہ اخلاقیات سے تہی دست ہو چکے ہیں اور اچھے یا برے کا فیصلہ اپنی خواہش کے پیش نظر کرتے ہیں۔ حلال اور حرام کی ان کے ہاں کوئی وقعت نہیں رہی۔ مولانا ندوی کے بقول:

> "اور وہ ہے اونچے طبقوں میں آنکھیں بند کر کے مادیات کے پیچھے دوڑنے کا رجحان کہ ہر عقیدہ اور ہر قدر اس پر قربان، دوسرے الفاظ میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا رجحان، دنیاوی زندگی پر فریفتگی اور نفس پرستی کا رجحان اور پھر اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا کرتا ہے یعنی اخلاقی بے راہ روی، محرمات الٰہیہ کا استخفاف، فسق و شراب کا شیوہ و عموم اور

اسلامی فرائض وقیود سے کلی آزادی۔ جیسے اس طبقہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یا اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کوئی داستان پارینہ اور قصہ وافسانہ ہے۔"[12]

تجاویز و سفارشات

☆۔۔۔اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے ہمیں امت مسلمہ کے اندر تہذیبی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ امت مسلمہ میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ ہماری تہذیب ہی آفاقیت کی حامل ہے اور دنیا و آخرت کی بھلائی اسی تہذیب میں مضمر ہے۔

☆۔۔۔یہ بھی ضروری ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کے مثبت و منفی عناصر کا مکمل تجزیہ کیا جائے اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ لوگوں غلط اور صحیح کا امتیاز پیدا ہو۔

☆۔۔۔اس سلسلے میں قومی غیرت و حمیت کو بیدار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ امت مسلمہ قومی حمیت کے بغیر ان خطرات سے نہیں نمٹ سکتی۔ اس کے لیے اسلامی تہذیب اور اس کے عناصر کے بارے میں مکمل آگاہی اور اس کے فوائد کا ادراک ہونا ناگزیر ہے۔

اہل فکر و دانش کے لیے بڑا امتحان ہے کہ وہ اس نازک موڑ پر امت مسلمہ کی راہ نمائی کریں اور تہذیبی جنگ میں اپنی آواز کو مؤثر بنائیں تاکہ اہل اسلام مغربی تہذیب کے مثبت اثرات سے مستفید ہوں اور منفی اثرات سے محفوظ رہیں۔

حوالہ جات

[1] ۔ندوی، سید ابو الحسن علی۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔ ص: ٹائٹل

[2] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:12

[3] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:17

[4] ۔انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص:220

[5] ۔انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص:224

[6] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:38

[7] ۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:24

[8] ۔دعوت فکر و عمل۔ ص:168

[9]۔القرآن،سورۃ القیامۃ:02

[10]۔القرآن،سورۃ الشوری:20

[11] ۔دعوت فکر و عمل۔ص:172

[12] ۔ذہنی اور اعتقادی ارتداد۔ص:16